دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات میں تضادات
(قرآن و سنت کی روشنی میں)

شہزاد اقبال شام☆

[اس مقالہ میں بعض اہم نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض کے بارے میں ایک سے زائد آراء کا امکان ہوسکتا ہے۔علمی و تحقیقی و معروضی انداز میں اختلافی ملاحظات کے لئے فکر و نظر کے صفحات حاضر ہیں۔ مدیر]

تمہید

دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء(۱) کے متعلق ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ اپنی موجودہ شکل میں مجموعی ساخت اور روح کے اعتبار سے گزشتہ تمام دساتیر سے کہیں زیادہ اسلامی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اس کے ایک آرٹیکل کے مطابق قرآن و سنت سے متصادم یا ان کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا(۲)۔ پہلے سے رائج الوقت قوانین کی جانچ پرکھ کے لیے اس کے اندر ایک طریق کار موجود ہے جس سے گزر کر قوانین کو اسلامی تقاضوں کے مطابق بنایا جا سکتا ہے(۳)۔ یہ دونوں راستے اختیار کرنے کے لیے متعلقہ عدالتی نظام کو انتظامیہ کے اثر و نفوذ سے آزاد رکھا گیا ہے۔ یہ دستوری و قانونی اتمام حجت سیاسی جماعتوں، مذہبی اداروں، علماء، قانون دانوں اور سوچنے سمجھنے والے اصحاب کو دعوت فکر دیتا ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام کریں۔ اب ان افراد اور اداروں کے ذمہ یہ کام ہوتا ہے کہ متعلقہ قانونی شقوں یا کسی پورے قانون کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں اور اطمینان نہ ہونے پر عدالتی چارہ جوئی کریں۔ یہ کام پاکستان کی دستوری تاریخ میں گزشتہ دو اڑھائی عشروں سے جاری ہے اور اس مشق کے باعث ملک کے درجنوں قوانین یا ان کے متعلقہ حصے کالعدم ہوئے یا ان کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنا لیا گیا ہے۔

لیکن اگر خود دستور کے اندر قرآن و سنت سے متصادم مواد ہو تو اس کا تدارک کیسے ہو؟ اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ قراردادِ مقاصد کے مرتبہ اور مقام کو تمام دساتیر کا خلاصہ قرار دیا جائے تو یہ درست ہو گا ۔ یہ مملکت کے دستوری سفر کا نقطہ آغاز تھا(۴)۔ یہ قرارداد بنیادی اصولوں کی کمیٹی کا رپورٹ دیباچہ قرار پائی(۵)۔ ۱۹۵۴ء کے مسودہ دستور میں بھی یہ دیباچے کے طور پر شامل رہی(۶)۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

۱۹۵۶ء کے منظور شدہ دستور میں بھی یہ شامل رہی(۷)۔ ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی اس سے اعراض نہ کیا جا سکا(۸)، اگرچہ اس دستور میں یہ اپنی مسخ شدہ حالت میں تھی۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ اپنی اصل شکل میں دستور کے دیباچے میں شامل رہی(۹) تاآنکہ اسے دیباچے کے مرتبہ سے اٹھا کر ۱۹۸۵ء میں باقاعدہ آرٹیکل کی حیثیت میں دستور کے اندر داخل کیا گیا(۱۰)۔ اس آخری تبدیلی کے بعد قرآن و سنت کے حوالے سے دستور پر نظر رکھنے والوں کا بڑی حد تک اطمینان ہو گیا کہ اس تبدیلی کے سبب اب قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا عمل باقاعدہ ہو جائے گا۔ لیکن سپریم کورٹ کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ صدر مملکت کا اختیار عفو والا آرٹیکل قرارداد مقاصد کے مقابلے میں ضعف کا شکار ہے تو عدالتی فیصلے کے بعد قراردادِ مقاصد کا مرتبہ و مقام گھوم پھر کر اس اختیار عفو کی حد تک وہیں دیباچے کی سطح پر آ گیا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے میں کہا گیا کہ:

Accodingly, now if any question is raised in connection with the validity of any existing provision of the Constitution on the ground that it transgresses the limits prescribed by Allah Almighty (within which His people were competent to make laws) such a question can only be resolved by the Majlis-i-Shoora (Parliament), which can, if the plea is well founded, take the necessary remedial action by making suitable amendments in the impugned provision in order to bring it within the limits prescribed by Allah Almighty.

Accordingly, in the instant case, if the High Court considered that the existing provision of Article 45 of the Constitution contravened the Injunctions of Islam in some respects it should have brought the transgression to the notice of the Parliament which along was competent to amend the Constitution, and could initiate remedial legislation to bring the impugned provison in conformity with the Injuctions of Islam(11)

ترجمہ: لہٰذا اب دستور کی موجودہ دفعہ کے جواز پراگر کوئی سوال اس بنیاد پر اٹھایا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی متعین حدود سے متجاوز ہے (جس پر اس کے بندے قوانین وضع کرنے کی اہلیت رکھتے تھے) تو اس مسئلے کو صرف مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) ہی طے کر سکتی ہے جو عذر کا بخوبی جواب ہونے پر اس قابل گرفت دفعہ میں مناسب ترامیم کے ذریعے تدارک کی ضروری تدبیر کر سکتی ہے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کی متعین حدود کے اندر لایا جائے۔

اس طرح زیرنظر مقدمے میں ہائی کورٹ کے خیال میں دستور کا آرٹیکل ۴۵ بعض زاویوں سے اسلام کی تعلیمات کے منافی تھا تو اسے پارلیمنٹ کے علم میں لایا جانا چاہیے تھا، صرف وہی دستور میں ترمیم کی مجاز تھی اور اس زیربحث دفعہ کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق بنانے کے لیے مناسب قانون سازی کر سکتی تھی۔

اس ایک مثال سے واضح ہو سکتا ہے کہ دستور کو مکمل طور پر اسلامی قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ یہ دستور واقعتاً مکمل اسلامی ہو۔ اگر اس کے حصے باہم متناقض ہوں تو ایک تضاد کا سہارا لے کر کوئی عدالت دستور کے کسی حصے کو غیر مؤثر کر سکتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس غیر مؤثر حصے کی مدد سے کسی دوسرے مؤثر حصے کو بے اثر کرنا آسان ہو سکتا ہے۔ یوں پورے دستور میں موجود اسلامی رنگ نقش بر آب ثابت ہو سکتا ہے۔

موجودہ دستور کے ایک حصے میں قرآن و سنت کو تمام قوانین کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے تو اگلے کسی حصے میں کوئی ایسی بات موجود ہوتی ہے جو قرآن و سنت سے منافی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا حوالے کی تفصیل یہ ہے کہ دستورِ پاکستان میں صدر پاکستان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی عدالت یا ٹریبونل کے کسی فیصلے کو معافی میں بدل دے۔ قتل کے مقدمات میں رحم کی اپیل کے ضمن میں بھی صدر یہ اختیار استعمال کرتے ہوئے مجرم کو آزاد کر سکتا ہے، اس کی سزائے موت کو بدل کر کوئی دوسری تخفیفی سزا دے سکتا ہے۔ ادھر عدالتی عمل سے گزرتے ہوئے تعزیرات پاکستان کی بعض دفعات کو قرآن وسنت کے منافی قرار دے دیا گیا۔ سپریم کورٹ کے حتمی فیصلے کے نتیجے میں نئی قانون سازی کی ضرورت پیش آگئی۔ وہ قانون سازی عین اسلامی تعلیمات کے مطابق تھی جس کے تحت مقتول کے ورثاء ہی کو اختیار تھا کہ وہ قاتل سے مصالحت کر لیں، دیت پر راضی ہو جائیں یا اسے معاف کر دیں۔ اسلامی تعلیمات مقتول کے وارث کے علاوہ کسی اور کو یہ حق نہیں دیتیں۔ قاتل کو معاف کرنے کا اختیار شریعت اسلامی میں صرف مقتول کے ورثاء کو ہے، صدر کو نہیں لیکن دستور میں یہ اختیار صدر کو دیا گیا ہے کہ وہ کوئی بھی سزا معاف کر دے، اس میں کمی کر دے یا اسے کسی دوسری سزا میں

بدل دے[۱۲]۔

اس تمہید کا مقصد دستورِ پاکستان کے ان حصوں کی نشاندہی کرنا ہے جو دستور کا حصہ ہوتے ہوئے بھی بادی النظر میں اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں۔ بحث کے اس حصے میں دستورِ پاکستان کے ان حصوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو اسلامی تعلیمات کے حوالے سے باہم متناقض ہیں۔ اگر ان متعلقہ حصوں کو آئندہ آنے والی کوئی اسمبلی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کر دے تو یہ قیام پاکستان کے مقصد کے خاکے میں رنگ بھرنے کے مترادف ہو گا۔

ملزم کی گرفتاری' امتناعی نظر بندی' مدت اور طریق کار

دستور کے حصہ دوم کا پہلا باب بنیادی حقوق کے متعلق ہے۔ ان حقوق سے متعلقہ ایک آرٹیکل محل نظر ہے جس کے مطابق ''کوئی شخص جان اور آزادی سے' ماسوائے قانون کے مطابق' محروم نہیں کیا جائے گا''۔[۱۳]

دستور مملکت کے تمام باشندوں یا غالب اکثریت کی خواہشات کا مظہر ہوتا ہے لیکن اس کی روشنی میں بننے والے قوانین عام طور پر کسی سیاسی جماعت کے انتخابی منشور کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان قوانین میں اس سیاسی جماعت کے سیاسی نظریات اور افکار پائے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ قوانین معاشرے کے تمام طبقات اور اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوں۔

پسماندہ ممالک میں عام طور پر سیاسی حکومتیں سیاسی مخالفین کو سامنے رکھ کر قانون بناتی ہیں اور پھر مخالفین کے خلاف اسے استعمال بھی کرتی ہیں۔ اس لیے زیرنظر عبارت میں ''ماسوائے قانون کے مطابق'' محل نظر ہے۔ ملک میں امتناعی نظربندی کے قوانین انتظامیہ کو وسیع اختیارات دیتے ہیں۔ عدالتی عمل کے بغیر کسی شخص کو انتظامیہ لمبی مدت تک نظربند کر سکتی ہے اور یہ ''قانون کے عین مطابق'' ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ایسے قوانین کی جانچ پرکھ عدالت کا کام ہے کہ وہ انہیں آئین کے مطابق یا برعکس قرار دے۔ لیکن اس کام کے لیے کسی مدعی کا ہونا ضروری ہے۔ عدالت مدعی کے حق میں فیصلہ دے بھی دے تو آئین کے اسی آرٹیکل کے تحت بعد میں آنے والی حکومتوں کے لیے کسی نئے انداز میں ویسی ہی قانون سازی کرنے کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ پس اس آرٹیکل میں ''ماسوائے قانون کے مطابق'' کی ترکیب 'ماسوائے عدالتی عمل کے تحت'' کے الفاظ سے بدل دی جانی چاہیے تاکہ ان امکانات کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ یہ شریعت اسلامیہ اور قانون فطرت کے زیادہ قریب ہو گا۔

اسی باب میں آرٹیکل ۱۰ کہیں زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے اس آرٹیکل

کی روح بادی النظر میں غیراسلامی ہے۔ یہ آرٹیکل بنیادی حقوق کے باب میں ہے جبکہ اپنی روح کے اعتبار سے اس کا بنیادی حقوق سے کوئی واسطہ ہی نہیں' بلکہ اس آرٹیکل میں شہری آزادیوں کے خاتمہ کا ایک آئینی طریق کار طے کیا گیا ہے۔

آرٹیکل کی پہلی شق کے مطابق کسی شخص کو گرفتاری کی وجہ بتائے بغیر گرفتار نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے اپنی پسند کے قانون دان سے قانونی مشاورت کے حق سے محروم کیا جائے گا۔دوسری شق میں بتایا گیا ہے کہ ہر گرفتار شخص کو گرفتاری کے بعد اگلے چوبیں گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اس میں گرفتاری کے مقام سے نزدیک ترین مجسٹریٹ کی عدالت تک سفر کا دورانیہ شامل نہیں ہو گا۔ مجسٹریٹ کی اجازت کے بعد ایسا کوئی شخص مذکورہ مدت سے زائد حراست میں نہیں رکھا جائے گا(۱۴)۔

ان دونوں شقوں کا اطلاق اس شخص پر نہیں ہو گا جسے امتناعی نظربندی کے کسی قانون کے تحت گرفتار کیا گیا ہو یا حراست میں لیا گیا ہو۔اگلی شق میں کہا گیا ہے کہ امتناعی نظر بندی کے قوانین صرف ان افراد کے لیے بنائے جائیں گے جو مندرجہ ذیل امور میں سے کسی کے لیے خطرہ ہوں:

(۱) پاکستان یا اس کے کسی حصے کی سالمیت' سلامتی یا دفاع
(۲) پاکستان کے خارجہ امور
(۳) عوامی نظم و ضبط
(۴) رسد کی فراہمی

ان امور کے بارے میں قانون سازی کی جا سکتی ہے' پھر بھی گرفتار شدہ افراد کو تین ماہ سے زیادہ حراست میں نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن اس مقصد کے لیے تشکیل دیئے جانے والے ایک نظرثانی بورڈ کی رائے میں' گرفتار شخص کو صفائی کا موقع دینے کے بعد' اضافی مدت کے لیے نظربند رکھنے کی معقول وجوہ ہوں تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسے کسی شخص کو وفاقی قانون کے تحت گرفتار کیا جائے تو نظرثانی بورڈ سے مراد ایک چیئرمین اور دو ایسے ارکان ہیں جن میں سے ہر ایک سپریم کورٹ کا یا ہائی کورٹ کا جج ہو' یا رہ چکا ہو۔ اس بورڈ کی تشکیل چیف جسٹس آف پاکستان کریں گے۔ اگر ایسا کوئی شخص کسی صوبائی قانون کے تحت گرفتار کیا جائے تو نظرثانی بورڈ ایک چیئرمین اور دو ایسے ارکان پر مشتمل ہو گا جن میں سے ہر ایک ہائی کورٹ کا جج ہو' یا رہ چکا ہو۔ اس بورڈ کی تشکیل متعلقہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کریں گے۔ بورڈ کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔

امتناعی نظربندی کے اس آرٹیکل کے تحت گرفتار کیے جانے والے شخص کو پندرہ دن کے اندر گرفتاری کی بنیاد بتانا ضروری ہے تا کہ وہ نظربندی کے جواز کے خلاف اپیل کر سکے۔ لیکن نظربندی کا حکم جاری کرنے والی اتھارٹی اگر عوامی مفاد میں سمجھے تو اس کی گرفتاری کے حقائق چھپائے جا سکتے ہیں(۱۵)۔

نظرثانی بورڈ کو تمام متعلقہ دستاویزات مہیا کرنا' گرفتاری کا حکم نامہ جاری کرنے والی اتھارٹی کی ذمہ داری ہے۔ عوامی مفاد میں ہو' تو یہ دستاویزات مہیا کرنا ضروری نہیں۔ اس صورت میں متعلقہ حکومت کا سیکرٹری کے عہدے کا شخص ایک سرٹیفکیٹ دے گا کہ متعلقہ دستاویزات مہیا کرنا عوامی مفاد میں نہیں ہے(۱۶)۔

مذکورہ بالا لوگوں میں سے جن پر امن عامہ خراب کرنے کا الزام ہو' انہیں پہلی مرتبہ نظربند کر کے ابتدائی دو برسوں میں آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ نظربند نہیں رکھا جا سکتا۔ باقی تینوں زمروں کو ابتدائی دو برسوں میں بارہ ماہ سے زیادہ عرصہ نظربند نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن جو لوگ دشمن کے ایجنٹ ہوں' یا کسی ایسی تنظیم سے وابستہ ہوں جو ملکی سلامتی کے منافی سرگرمیوں میں ملوث ہوں' ان پر اس شق کا اطلاق نہیں ہو گا۔ انہیں بلا تحدید مدت نظربند یا زیرحراست رکھا جا سکتا ہے۔ زیرحراست رکھے جانے والے شخص کا مقام حراست نظر ثانی بورڈ طے کرے گا اور اس کے اہل خانہ کے لیے معقول گزارہ الاؤنس بھی طے کرے گا۔ یہ آرٹیکل غیرملکی دشمنوں کے لیے غیرمؤثر ہے۔

امتناعی نظر بندی پر اسلام کا زاویہ نگاہ

اسلام کے تصور ریاست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مقاصد خمسہ کے حصول کے لیے امام کو بے پناہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ انہی میں سے امتناعی نظربندی یا اس سے ملتا جلتا اختیار بھی ہوتا ہے۔ معاشرے میں فساد پھیلنے کا اندیشہ ہو تو کسی معصوم شخص کو علاقہ بدر کرنا امام کے اختیار میں ہے۔ حضرت عمرؓ نے مدینے کے ایک بالکل معصوم شخص کو اس وجہ سے علاقہ بدر کر دیا تھا کہ اس کے حسن کے چرچے قرب و جوار کی عورتوں کی زبان پر تھے' اس شخص کا کوئی جرم نہ تھا۔ پہلے قدم کے طور پر انہوں نے اس شخص کا سر منڈایا تو اس کا حسن نکھر کر سامنے آ گیا۔ تب انہوں نے اسے مدینہ بدر کر دیا(۱۷)۔

کتب اصول میں امتناعی نظربندی کے تصور سے ملتا جلتا ایک اصول سدالذرائع بھی ملتا ہے۔ جس

کا مقصد کم و بیش وہی ہے جو امتناعی نظربندی کے قانون میں ہے[۱۸]۔ اس تناظر میں کسی شخص کی امتناعی نظربندی کا تصور بظاہر کوئی غیرمعمولی قدم نہیں۔ بظاہر یہ اسلام کے تصور ریاست کے عین مطابق ہے۔ لیکن جو بات محل نظر ہے وہ امتناعی نظربندی کے اس زیرنظر آرٹیکل کے عملی پہلو ہیں جو خلاف اسلام ہی نہیں، خلاف فطرت بھی ہیں۔

شرعی اصول کے پیمانے پر پرکھا جائے تو امتناعی نظربندی کے متعلق متعلقہ دستوری آرٹیکل بظاہر دونوں اعتبار سے درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ سدالذرائع کے اصول کے تحت مفسدہ کے پیدا ہونے سے قبل اس کا قلع قمع کرنا عین شرعی ہے۔ اصولیین، سد الذرائع کو اسلامی قانون کا ایک مؤثر مأخذ تسلیم کرتے ہیں[۱۹]۔ امام کے اختیارات کے اعتبار سے اس آرٹیکل کا جائزہ لیا جائے تو بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ امتناعی نظر بندی کی یہ شکل اسلام کے تصور ریاست سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی جس میں نہ تو کوئی مفسدہ پایا جائے اور نہ اصولِ سدِ ذرائع پیش نظر ہو۔

اس گفتگو سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ کسی مفسدہ کے تدارک کی خاطر امام کو کافی اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن دستور کے زیرنظر آرٹیکل میں اجمال ہے، کسی مفسدہ کا ذکر نہیں ملتا۔ یہیں سے ریاستی اقتدار کی تحدید شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ۔[۲۰]

ترجمہ: کسی شخص کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے غلام بن جاؤ، (بلکہ) وہ تو یہی کہے گا کہ صرف اللہ کے غلام بنو، جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم تقاضا کرتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی یہی کچھ ثابت ہوتا ہے۔ ابوداؤد کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو ایک شخص نے اپنے پڑوسی کی گرفتاری پر احتجاج کیا۔ حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

فقال جیرانی بما اخذوا فاعرض له مرتین ثم ذكر شيئاً فقال النبی صلی الله علیه وسلم خلوا له عن جیرانه.[۲۱]

ترجمہ: پس (اس نے) کہا میرے پڑوسیوں نے کیا کسی سے کچھ لیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دفعہ اعراض فرمایا۔ پھر کسی اور شے کا ذکر کیا، پھر فرمایا، اس کے

پڑوسیوں کو اس کے لیے چھوڑ دو۔

اندازہ کیجئے یہاں ایک شخص اس مقدمے میں فریق نہیں لیکن مفاد عامہ میں سربراہ ریاست سے سوال کر رہا ہے کہ میرا پڑوسی کس جرم میں گرفتار ہوا ہے۔ چونکہ پڑوسی کا جرم نہیں تھا، اس لیے اسے رہا کر دیا گیا۔ گویا شخصی آزادی کوئی ایسا معاملہ نہیں جو محبوس کے ورثاء ہی عدالت میں لے کر جائیں بلکہ یہ امت کی اجتماعی آزادی کا نکتہ ہے جس میں کوئی بھی شخص مدعی بن کر مظلوم کی طرف سے پیش ہو سکتا ہے۔ مجموعی اسلامی تعلیمات ہر زاویے سے لوگوں کو سزاؤں سے براءت کی گنجائش دینے کی طرف لے جاتی ہیں۔ ترمذی کی ایک حدیث اسی مضمون کی ہے جس میں کہا گیا ہے:

عن عائشة قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ادرأوا الحدود عن المسلمين ماااستطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله فان الامام ان يخطى فى العفو خير من ان يخطئ فى العقوبة. (۲۲)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ،جہاں تک تم سے ہو سکے، مسلمانوں سے حدود کو دفع کرو اور ٹالو، پھر اگر مجرم کی رہائی کی کوئی شکل ممکن ہو تو اسے چھوڑ دو، کیونکہ امام کا عفو میں غلطی کرنا، سزا دہی میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حدوداللہ جیسے نازک معاملے میں اللہ کریم لوگوں کو رخصت دیتے ہیں، قصاص و دیت کے معاملے میں ورثاء کو معافی کا اختیار دے کر ریاستی اختیارات پر بے پناہ تحدید عائد کر دی تو امتناعی نظربندی کی گنجائش نکالنا اسلامی تعلیمات کے حوالے سے بڑا مشکل کام ہے۔

فقہ حنفی کے مشہور امام ابویوسف نے حبس بالتہمہ کے متعلق خلیفہ وقت کو یوں رولنگ دی :

امیرالمؤمنین! آپ اپنے والیوں کو ہدایت کر دیجئے کہ صرف تہمت کی بنا پر لوگوں سے کوئی مواخذہ نہ کریں …… رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہمت کی بنا پر لوگوں سے مواخذہ نہیں کرتے تھے (۲۳)۔

دستور چار طرح کے افراد کے بارے میں بحث کرتا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عام جرائم کے الزام میں گرفتار ہونے والے اشخاص

(۲) امتناعی نظربندی کے تحت گرفتار ہونے والے اشخاص

(۳) دشمن کا ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار افراد یا کسی دشمن ملک سے وابستگی کے الزام میں

گرفتار افراد

(۴) دشمن کے غیرملکی ایجنٹ(۲۴)

ان میں سے پہلے اور چوتھے زمرے کے افراد--- عام جرائم میں گرفتار اور دشمن کے غیرملکی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار--- وہ ہیں جن کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ پہلے زمرے والوں کے لیے مناسب دستوری تحفظ موجود ہے۔ چوتھی طرح کے افراد، یعنی دشمن کے غیرملکی ایجنٹوں کے لیے بھی متعلقہ ممالک سے دوہرے معاہدات ہوتے ہیں جن کے تحت ممالک ایک دوسرے کے قیدیوں کے ساتھ معاہدے کے مطابق سلوک کرتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو دشمن ملک کا ایجنٹ یا کسی ملک سے وابستگی کے الزام میں گرفتار ہوں تو ان کے لیے آرٹیکل ۱۰ کی عبارتیں محل نظر ہیں۔

کسی شخص پر یہ الزام لگتے ہی کہ وہ مذکورہ بالا چار امور میں سے کسی کی زد میں آتا ہے' انتظامیہ کو یہ اختیار مل جاتا ہے کہ وہ اسے کم از کم تین ماہ کے لیے حراست میں لے لے' چاہے الزام مطلقاً غلط ہو۔ کسی سیاسی مخالف سے سیاسی میدان میں خطرہ ہو تو بغیر عدالتی عمل کے اسے قید کرنا ممکن ہے(۲۵)۔ یہ بات انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔ امتناعی نظربندی کا اسلامی تصور اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ حضرت علیؓ کے دور خلافت میں پانچ خارجیوں کا ایک گروہ گرفتار کر کے آپ کے سامنے لایا گیا کہ انہیں سزا دی جائے۔ ان افراد پر یہ الزام تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو علی الاعلان گالیاں دے رہے تھے۔ ایک تو یہ دھمکی دے رہا تھا کہ میں علی کو قتل کر دوں گا۔ حضرت علیؓ نے ان سب کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ لوگ کوئی جرم نہ کریں' میں انہیں کیسے سزا دے سکتا ہوں(۲۶)۔

عہدحاضر میں ریاستی امور بہت بڑی حد تک بین الاقوامی اتار چڑھاؤ سے مشروط ہوتے ہیں جن کے باعث امتناعی نظربندی کے جواز اور عدم جواز پر کسی قدر مزید غور کی ضرورت ہے کیونکہ آج کل جرائم دوسری ریاستوں کی مدد سے بھی ہوتے ہیں۔ اگر عام قانون کے تحت ثبوت ہوتے ہوئے بھی کسی شخص کو ریاست عدالت کے کٹہرے میں لانا چاہے تو سفارتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لیے اس نکتے پر مزید غور کی ضرورت یقیناً موجود ہے۔

امتناعی نظربندی میں زیرحراست شخص کو اولاً تین ماہ تک بغیر کسی عدالتی عمل کے قید رکھنے کا اختیار انتظامیہ کے پاس ہے۔ تین ماہ بعد نظرثانی بورڈ کے پاس مقدمہ آتا ہے یا نہیں' یہ بھی انتظامی مسئلہ

ہے۔ عملاً اس سلسلے کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے کہ زیرحراست شخص کو طویل مدت کے لیے بلاجواز حراست میں رکھا جا سکتا ہے۔ نظرثانی بورڈ کی تشکیل دستوری طور پر اس قدر مشکل رکھی گئی ہے کہ حصول انصاف کے تقاضے پورے ہونا محال لگتا ہے۔ کسی دور افتادہ شہر کے کسی معمولی سیاسی کارکن کو امتناعی نظربندی کے قانون کے تحت گرفتار کیا جائے تو متعلقہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں معاملہ لانا طویل ذہنی ریاضت، مالی مشکلات، خانگی اتار چڑھاؤ اور بے پناہ وسائل کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ آمرانہ حکومت میں تو شاید قابل برداشت ہو دستور کی موجودگی میں جمہوری نظام میں سیاسی قیادت اور کارکن ذہنی طور پر اس نوع کی دستوری پابندیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ نظربندی کے ابتدائی پندرہ دنوں میں انتظامیہ کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ نظربند شخص کو بے شک آخری دن نظر بندی کی وجوہ سے آگاہ کرے۔ نظرثانی بورڈ متعلقہ دستاویزات مہیا کرنے کو کہے تو متعلقہ حکومت کے سیکرٹری کے پاس یہ تصدیق نامہ پیش کرنے کا اختیار موجود ہے کہ دستاویزات پیش کرنا عوامی مفاد میں نہیں ہے۔ ممکن ہے نظرثانی بورڈ سرٹیفکیٹ کی عبارت سے مطمئن نہ ہو اور دستاویزات پیش کرنے پر اصرار کرے تو اس ساری مشق میں عدالتی عمل لیت ولعل کا شکار ہو سکتا ہے۔

اس معاملہ میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تک معاملہ کا لایا جانا ناقابل فہم ہے۔ معاملہ کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن یہ مسئلہ نچلے عدالتی نظام کے ذریعے بھی حل ہو سکتا ہے۔ ضلعی افسر عدل (District & Session Judge) اپنے عدالتی اختیارات کے اعتبار سے کسی شخص کو انتہائی سزا--- سزائے موت--- تک دینے کا مجاز ہے لیکن کسی شخص کو نظربند رکھنا اس کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا گیا ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ طویل عدالتی عمل کے ذریعے انتظامیہ کو زیادہ وقت مل سکے کیونکہ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ تک رسائی ہر شخص کے لیے آسان نہیں ۔ حصول عدل کے لیے ضروری ہے کہ انصاف افراد کی دہلیز تک پہنچایا جائے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ یہ آرٹیکل مزید غور کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس بھیجا جائے۔

امتناعی نظربندی کے اس آرٹیکل کے تحت کسی بھی شخص کو اگلے چوبیس گھنٹے کے اندر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج--- نہ کہ مجسٹریٹ--- کی عدالت میں پیش کرنا ضروری ہونا چاہیے تاکہ ملزم کو صفائی کا موقع دیا جائے اور مزید نظربندی کے لیے جج فیصلہ کرے کہ ملزم کو مزید کتنی مدت زیرحراست رکھنا عوامی مفاد میں ہے۔ مزید زیرحراست رکھنے کی صورت میں جج اسی وقت ملزم کے اہل خانہ کے لیے گزارہ الاؤنس کا حکم دے۔ موجودہ صورت حال میں ملزم کو ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی بجائے مجسٹریٹ کے پاس لے جانے کی پابندی ہے جس سے معاملہ مزید طول پکڑ جاتا ہے۔

ضلعی سطح پر حراست کا فیصلہ ہو جانے کے بعد ملزم کو ہائی کورٹ میں اپیل.کا حق دیا جانا چاہیے۔ مقدمے سے متعلق تمام کاغذات عدالت میں پیش کرنا ضروری ہو لیکن عدالت --- نہ کہ انتظامیہ--- ضروری خیال کرے تو ملکی سلامتی سے متعلق دستاویزات کا معائنہ بند کمرے میں ہو سکتا ہے۔ تمام حالتوں میں زیرحراست کو گرفتاری کی وجہ بتانا ضروری ہو اور اسے اس کی پسند کے وکیل سے قانونی مدد فراہم کرنا دستوری طور پر لازم ہو۔

اسی آرٹیکل کی ایک ذیلی شق میں کہا گیا ہے کہ امن عامہ خراب کرنے کے ملزموں کو ابتدائی دو سالوں میں زیادہ سے زیادہ آٹھ ماہ نظر بند رکھا جا سکتا ہے۔ اسی ذیلی شق میں کہا گیا ہے کہ آٹھ ماہ نظربند رکھنے کی انتہائی مدت دشمن کے ایجنٹوں اور ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تنظیموں سے وابستہ افراد کے لیے نہیں ہے' انہیں بلاتحدید مدت نظربند رکھا جا سکتا ہے۔

اس شق کو اجتماع ضدین کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس آرٹیکل کے اندر کئی متضاد عناصر جمع کر دیئے گئے ہیں۔ آرٹیکل کے عنوان کا جائزہ لیا جائے تو یہ بنیادی انسانی حقوق کے تذکرے کا ایک آرٹیکل ہے۔ لہٰذا اس عنوان کے تحت امتناعی نظربندی جیسے تصورات کا ذکر محل نظر ہے۔ غور سے مطالعہ کیا جائے تو انتظامیہ نے ریاستی جبر کو دستوری تحفظ فراہم کرنے کے لیے یہاں بنیادی حقوق پر قدغن لگائی ہے جس میں کوشش کی گئی ہے کہ یہ قدغن آزاد جمہوری دنیا کے لیے بہت زیادہ قابل اعتراض نہ ہو۔ اس طرح بنیادی حقوق کے باب میں یہ آرٹیکل بنیادی حقوق مرحمت نہیں کرتا بلکہ یہ ان کی تحدید کرتا ہے۔ اسلامی نظام عدل بندگان خدا کو اس حد تک مجبور محض نہیں بناتا کہ انتظامی مشنری کا کوئی عام عہدے دار انہیں بلاجواز طویل مدت کے لیے پابند سلاسل کر دے۔

صدر کی نیابت

دستور کے آرٹیکل (۲)۴۱ کے تحت صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے لیکن چیئرمین سینٹ اور اسپیکر قومی اسمبلی کے مذہب کے متعلق دستور مطلقاً خاموش ہے۔ یہ دونوں عہدے غیرمسلم ارکان پارلیمنٹ کے پاس ہوں تو اس میں کوئی دستوری رکاوٹ نہیں ہے۔جب چیئرمین سینٹ یا اسپیکر قومی اسمبلی دونوں' یا دونوں میں سے کوئی ایک غیرمسلم ہو اور مسلم صدر کسی وجہ سے اپنے وظائف (Functions)ادا نہ کر رہا ہو تو ایسی صورت حال میں چیئرمین سینٹ یا اسپیکر قومی اسمبلی' صدر کے انتخاب تک صدر کے فرائض انجام دے گا۔ متعلقہ عبارت کا ترجمہ یوں ہے ''اگر صدارتی منصب بوجہ موت' استعفیٰ یا صدر کے ہٹائے جانے کے باعث خالی ہو' تو چیئرمین سینٹ' یا اگر وہ صدارتی منصب

کے وظائف پورے نہ کر سکتا ہو تو' قومی اسمبلی کا اسپیکر صدر کے انتخاب تک بطور صدر کام کرے گا''۔(۲۷) یہ صورت حال اس وقت اور بھی نازک موڑ تک جا سکتی ہے جب قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل ہو چکی ہوں اور صدر کا منصب کسی قائم مقام صدر کے پاس ہو اور وہ قائم مقام صدر غیرمسلم ہو۔ ایسے موقع پر کم و بیش تین ماہ تک یہ مملکت خداداد لازماً غیرمسلم سربراہ مملکت کی عنان اقتدار میں رہے گی۔ اس عرصے میں صدر کو بر بنائے عہدہ (ex officio) ایسے فیصلے کرنا پڑیں گے جن کا براہ راست مسلمانوں کے دین و ایمان کے ساتھ واسطہ ہو سکتا ہے۔ کئی ایسے اجلاس اور مجالس میں شرکت کرنا پڑے گی جہاں صرف مسلم حکمران ہی شرکت کر سکتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سیکورٹی کی حتمی معلومات افواج پاکستان کے سپریم کمانڈر کے پاس آتی ہیں جو صدر ہوتا ہے۔ جوہری توانائی اور اس کے استعمال کے بارے میں حساس معلومات تک اس کی رسائی ہوتی ہے جو عام حالات میں چیئرمین سینٹ یا اسپیکر قومی اسمبلی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ کئی ریاستی امور ایسے ہیں جو صرف صدر کے دائرہ عمل میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ۹۷ فی صد مسلم آبادی کے اس ملک کے صدر کے لیے مسلمان ہونا دستوری پابندی ہے تا کہ مسلمانوں کے اجتماعی امور کسی مسلمان ہی کے ہاتھ میں رہیں۔

زیربحث صورت حال کا امکان یقیناً بہت کم ہے لیکن بہرحال موجود ہے۔ ایسی صورت پیدا ہو جائے تو تین ماہ کے عرصے میں ملک کی سیکورٹی کا خطرناک حد تک متاثر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اس بحث کا مطلب قطعاً یہ نہیں ہے کہ ملک کی سلامتی کے لیے کوئی غیرمسلم صدر خطرہ ہو سکتا ہے' بلکہ اس سے مراد صرف اتنی ہے کہ دارالاسلام کا امام لازماً اہل ایمان ہی میں سے ہونا چاہیے کیونکہ یہ بات بے حد عجیب ہے کہ مسلمانوں کا سربراہ غیرمسلم ہو۔

مسلمانوں کا سربراہ فی الحقیقت نبی کا جانشین ہوا کرتا ہے۔ نبوت ختم ہونے کے بعد اب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت ان کے کسی امتی ہی نے کرنی ہے۔ مسلمان اپنے اجتماعی امور کسی ہیئت حاکمہ کو تفویض کرتے ہیں تو اس ہیئت حاکمہ کی سربراہی کا سزاوار جو شخص بھی ہو، وہ خلیفۃ الرسول کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ اس طرح خودبخود واجب ہو جاتا ہے کہ ایسا شخص مسلمان ہو۔ سربراہ مملکت کوئی ایسا عہدہ نہیں ہوتا جو کسی وقت خالی رہے۔ صدر کی غیرموجودگی میں اس کی نیابت لازم آتی ہے۔ نیابت کسی مسلمان ہی کو دی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں قرآن و سنت کی تعلیمات اس قدر واضح ہیں کہ ان کی تکرار تضیع اوقات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قرآن میں آتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ

الْمُنْكَرِ (۲۸)

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم اگر زمین میں تمکن بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔

یہاں مقتدر مسلمانوں کے فرائض یہ ہیں : اقامت صلوٰۃ، ادائیگی زکوۃ، معروف کا حکم اور منکر کی راہ میں رکاوٹ۔

ان چاروں کاموں کی توقع کسی مسلمان ہی سے کی جا سکتی ہے۔ کسی غیر مسلم سے نہ تو اس کی توقع ممکن ہے اور نہ غیر مسلم یہ کام کرے گا۔ اس لیے لازم ہے کہ صدر کی نیابت کے اہل ان دونوں مناصب کے لیے بھی وہی پابندی ہو جو منصب صدارت کے لیے ہے۔ ان دونوں مناصب پر کسی غیر مسلم کی تقرری ممکن نہ ہو' تاکہ گزشتہ سطور میں ممکنہ اندیشہ ہائے دور دراز سے بچا جا سکے۔ ۱۹۵۴ء کے مسودہ دستور میں اس بات کا بڑی خوبصورتی سے خیال رکھا گیا تھا۔ اس مسودہ دستور میں سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونا ضروری تھا۔ سربراہ مملکت کی عدم موجودگی میں چیئرمین ہاؤس آف یونٹ ہائے وفاق' چیئرمین ہاؤس آف پیپل یا اپنی تقرری کی تاریخ سے سینارٹی کی ترتیب سے کسی صوبے کا سب سے سینئر سربراہ یہ منصب سنبھال سکتا تھا' بشرطیکہ وہ سربراہ مملکت انتخاب کے لیے علاوہ ازیں اہلیت رکھتا ہو. (if otherwise qualified for election as Head of the State)(29). علاوہ ازیں اہلیت رکھنے سے مراد یہ ہے کہ ان میں سے جو شخص بھی سربراہ مملکت بننے کا اہل ہو جو مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چیئرمین ہاؤس آف یونٹ ہائے وفاق مسلمان نہ ہو تو قائم مقام سربراہ مملکت نہیں بن سکتا تھا۔ اس کے بعد چیئرمین ہاؤس آف پیپل بھی مسلمان نہ ہو تو سربراہان صوبہ جات میں سے جو بھی سینئر ترین سربراہ صوبہ مسلمان ہو' وہی یہ منصب سنبھال سکتا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ حسن و خوبی موجود نہیں ہے۔

عدالتی سزاؤں میں کمی بیشی اور تغیر و تبدل کے لیے صدر کا اختیار

دستور کے تیسرے حصے میں صدر کے اختیارات پر بعض دستوری اصول مذکور ہیں۔ دستور کے مطابق "صدر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی عدالت' ٹریبونل یا کسی دوسری اتھارٹی کی طرف سے دی گئی سزا کو ملتوی کرے' موقوف کرے' تبدیل کرے یا معطل کرے' اسے کسی دوسری سزا سے بدل ڈالے"(۳۰)۔

کسی جدید ریاست ہی میں نہیں خود اسلامی ریاست میں بھی صدر مملکت یا امام کو بے پناہ

دستوری اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جمہوری ممالک میں یہ اختیارات صدر کے نام پر وزیراعظم اور اس کی کابینہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اسلامی ریاست میں امام کو کسی جدید جمہوری ریاست کے صدر سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں جنہیں وہ موقع بہ موقع استعمال کرتا ہے۔ انہی اختیارات میں سے امام کا عدالتی سزاؤں کا معاف کرنے کا اختیار ہے۔ یہ اس کا صوابدیدی اختیار ہے لیکن بلاتحدید نہیں ہے، جیسا کہ آرٹیکل ۴۵ میں یہ اختیار بلاتحدید ہے۔ یہی آرٹیکل اپنی اسی عبارت کے ساتھ آج سے پانچ سو سال قبل کسی مسلمان ملک کے دستور میں بعینہٖ ہوتا تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا کہ صدر کا یہ اختیار باستثنائے حدود و قصاص ہے اور اس وقت کے ماحول، رائے عامہ، سیاسی اخلاقیات اور جدید مغربی تصورات حکومت و ریاست کے عدم وجود کے باعث کسی مسلم حکمران کے حاشیہ خیال میں نہ آتا کہ اس دستوری اختیار کو حدود اور قصاص کے مقدمات میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج حدود اور قصاص کے بارے میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے تصورات اتنے اطمینان بخش نہیں ہیں کہ صدر یا امام کو یہ اختیار بلا تحدید دیا جا سکے۔

حدود ان کے متعلق قرآن و سنت کی تعلیمات واضح اور مسلمہ ہیں۔ حدود کے مقدمات میں جرائم ثابت ہو جائیں اور ضروری شرائط پوری ہو جائیں تو مجرم کو سزا دینا واجب ہو جاتا ہے۔ پھر قاضی یا امام کو کوئی صوابدیدی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ مجرم کو معاف کر سکے۔ اسی طرح قصاص کے مقدمات میں بھی قاضی یا امام کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی عدالتی فیصلے کے خلاف کوئی دوسرا فیصلہ صادر کرے۔ یہ امر اسلام کے تصور جرم و سزا میں صدیوں سے مسلّم ہے جس کے حق میں یہاں دلائل دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق نفس مضمون سے نہیں ہے۔ ان مقدمات میں سزا کی معافی کا اختیار قتل کی صورت میں مقتول کے ورثاء کو اور اعضاء کے قصاص میں یہ اختیار خود متضرر ہی کو حاصل ہے۔ رہے تعزیری مقدمات تو ان میں حاکم کو بلاشبہ بعض شرائط کے ساتھ صوابدیدی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جنہیں وہ موقع بہ موقع استعمال کر سکتا ہے(۳۱)۔

دستورِ پاکستان کے زیرنظر آرٹیکل کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے لازم ہے کہ صوابدیدی اختیار میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ یہ حدود و قصاص کے مقدمات کو متأثر نہ کر سکے۔ تعزیری سزاؤں میں کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا زیربحث دستوری اختیار بھی ایسا کہ صدر بعض ناگزیر شرائط پوری ہونے پر ہی عدالتی فیصلے کو متأثر کر سکے۔ اسلامی نظام عدل کا ایک بنیادی اصول ہے کہ سزائیں معاشرے کے جملہ افراد کے لیے یکساں اعتبار سے نافذالعمل ہوتی ہیں۔ لیکن موجودہ نظام میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ مقتدر قوتیں اپنے اقرباء اور سیاسی کارکنوں کو دی گئی سزاؤں کے ضمن میں

اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے صدر کی رائے کو متاثر کر سکتی ہیں۔ اس کی ایک بین مثال تو موجود ہے۔ ۱۹۹۰ء میں اس وقت کی وزیراعظم نے بم دھماکوں سے لوگوں کے قتل عام کے جرم میں پھانسی پانے والے کئی لوگوں کی سزاؤں میں کمی کر دی تو مقتولین کے ورثاء ہائی کورٹ میں دادرسی کے لیے چلے گئے۔ ہائی کورٹ کو کہنا پڑا کہ صدر کو معافی کا اختیار نہیں ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

> The President of Pakistan had no such power to commute the death sentences awarded in matters of Hudood, Qisas and Diyat Ordinance. In this view of the matter, we are of the considered view that the power of pardon in such cases only vests with the heirs of the deceased; therefore, the cases in which death sentences have been awarded, the President had no power to commute, remit or pardon such sentences. However, the case would be on different footings, if a person has been punished by way of Ta'zir as in such cases, the Head of the state has the power to pardon the offender and that too in public interest(32).

> ترجمہ: حدود، قصاص اور دیت آرڈیننس کے معاملات میں دی گئی موت کی سزاؤں کے ضمن میں صدر پاکستان کو کوئی ایسا اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ ان میں رد و بدل کرے۔ معاملے کے اس زاویہ نگاہ کے اعتبار سے ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ان مقدمات میں اختیار عفو صرف مرنے والے ورثاء کے پاس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ مقدمات جن میں موت کی سزائیں سنائی گئی ہیں، صدر کو ایسا کوئی اختیار نہیں کہ وہ ان سزاؤں میں رد و بدل کرے، انہیں ختم کرے، یا وہ سزائیں معاف کر دے۔ تاہم اگر کسی شخص کو ان مقدمات میں تعزیر کے طور پر سزا دی گئی ہوتی تو مقدمے کی نوعیت مختلف ہوتی کیونکہ ان مقدمات میں سربراہ ریاست کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ مفاد عامہ کے تحت مجرم کو معافی دے دے۔

ہائی کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کی۔ اب صورت حال یوں واضح ہوئی کہ آرٹیکل ۲ الف کے تحت ریاستی امور اللہ کے تفویض کردہ اختیارات کے مطابق

چلانا ضروری ہے۔ اس اصول کے تحت مقتول کے ورثاء ہی قاتل کو معاف کر سکتے ہیں لیکن آرٹیکل ۴۵ میں صدر کو یہ اختیار ہے کہ کسی عدالت کی دی گئی سزا میں رد و بدل کر دے۔ زیرنظر مقدمے میں صدر کے اسی اختیار کو قرآن و سنت کے سہارے چیلنج کیا گیا تو سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں (جس کا ذکر اس مقالے کی ابتدا میں ہے) لکھا کہ ''اگر کوئی سوال اس بنیاد پر اٹھایا جاتا ہے یہ [صدر کا اختیار عفو] اللہ تعالیٰ کی حدود سے متجاوز ہے تو اس مسئلے کو صرف مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) ہی حل کر سکتی ہے''۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دے کر اپنے فہم کی حد تک اس امر کی توثیق کر دی کہ ان دونوں آرٹیکل میں تضاد موجود ہے۔

لہٰذا یہاں صدر کے اس اختیار پر تحدید عائد کرنا ضروری ہے جس کے لیے مناسب دستوری ترمیم ہو سکتی ہے۔

وزیراعظم کے لیے مذہب کی شرط

دستور کے تیسرے حصے میں وفاقی حکومت سے متعلقہ حصے میں آرٹیکل ۹۱ وزیراعظم کے متعلق ہے۔ ۱۹۷۳ء کے اصل دستور کے اس آرٹیکل کی شق ۲ کے مطابق ''اسپیکر اور ڈپٹی اسپیکر کے انتخاب کے بعد، قومی اسمبلی دوسرے تمام امور سے اعراض کرتے ہوئے بغیر کسی بحث کے، اپنے مسلم ارکان میں سے ایک رکن کو بطور وزیراعظم منتخب کرے گی (۳۳)''۔ اس آرٹیکل میں مسلم کی تقیید موجود تھی۔

۱۹۸۵ء میں دستور میں آٹھویں ترمیم کے بعد اس آرٹیکل نے یہ شکل اختیار کر لی ''صدر اپنی صوابدید پر قومی اسمبلی کے ارکان میں سے ایک وزیراعظم مقرر کرے گا جو اس کے خیال میں قومی اسمبلی کے ارکان کی اکثریت کے اعتماد کا حامل ہو گا (۳۴)''۔ اسی آرٹیکل میں مزید کہا گیا ہے کہ وزیراعظم اپنی تقرری کے بعد تیسرے جدول میں دی گئی حلف کی عبارت کے مطابق حلف اٹھائے گا اور ساٹھ دن کے اندر قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرے گا۔

۱۹۸۵ء سے قبل وزیراعظم کے لیے مسلمان ہونا لازم تھا۔ لیکن آٹھویں ترمیم کے بعد صدر قومی اسمبلی کے ارکان میں سے کسی بھی رکن کو وزیراعظم مقرر کر سکتا ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ یہ ترمیم ایک ایسے دور میں ہوئی جب جمہوری ماحول نہ تھا اور اس میں تعطل کے باعث اسمبلیوں میں سیاسی اعتبار سے ناپختہ افراد کی کثرت تھی۔ اس لیے عجلت میں اس ترمیم کا منظور ہو جانا قابل فہم ہے۔ تاہم یہ امر تحقیق کے لیے ایک علیحدہ موضوع ہے کہ وزیراعظم کے لیے مسلمان ہونے کی شرط ختم کرنے میں کن افراد یا اداروں کی سوچ کارفرما تھی اور اتنی بڑی تبدیلی پر ملکی پریس، دانشور

اور اسمبلی کے باہر دوسرے اہل نظر کیوں خاموش رہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ باعث تعجب امر یہ ہے کہ موجودہ حالت میں بھی وزیراعظم کے لیے حلف کی عبارت میں کوئی منفی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں دیئے گئے حلف نامے کے آخر میں ایک جملے کا اضافہ کیا گیا ہے کہ ''اللہ سے دعا ہے کہ وہ میری مدد اور راہنمائی فرمائے۔ آمین''،(۳۵) اس کے علاوہ حلف نامے کی عبارت اپنی اصل شکل میں جوں کی توں موجود ہے جو کسی مسلمان وزیراعظم ہی کے لیے ہوسکتی ہے۔

اس بنیادی تبدیلی کے بعد بھی، اور بالخصوص کثرت کے ساتھ مسلمان ارکان کی موجودگی میں، اس بات کا بظاہر کوئی امکان نہیں کہ صدر کسی غیرمسلم رکن اسمبلی کو وزیراعظم مقرر کرے گا، اس کے باوجود مسلمان ہونے کی شرط کے خاتمے نے دستوری امکانات کا دروازہ بہرحال کھول دیا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ ملکی اور غیرملکی پریس سالہا سال تک کسی غیرمسلم پاکستانی کی خدمات خلق، انسان دوستی، غریب نوازی، مذہبی رواداری، تحمل، حب الوطنی اور دیگر صفات حمیدہ کو عوام کے ذہنوں پر مسلسل نقش کرتا رہے، تاوقتیکہ دس بیس برس بعد بدعنوان سیاستدانوں، قارون صفت صنعت کاروں اور فرعون منش سرکاری افسران کے ستائے ہوئے افراد اس غیرمسلم پاکستانی کو اپنا نجات دہندہ سمجھ لیں۔ تب درون خانہ بین الاقوامی دباؤ کے نتیجہ میں صدر اسی غیرمسلم رکن اسمبلی کو وزیراعظم مقرر کر کے حلف اٹھانے کی تقریب تک لے آئیں۔

اس مفروضے کا ذرا دوسرے انداز سے جائزہ لیا جائے تو مذکورہ بالا صورت حال اس مفروضے کی مکمل تائید کرتی ہے۔

دستور میں درج ہے کہ آئین کے نفاذ کے بعد پندرہ سال کی مقررہ مدت میں قومی زبان اردو کو ملک بھر میں رائج کر دیا جائے گا(۳۶)۔ یہ مقررہ مدت کب کی ختم ہو چکی ہے مگر اردو سرکاری دفاتر میں اتنی ہی اجنبی ہے جتنی اس دستوری پابندی سے قبل تھی۔

دستور میں درج ہے کہ قوانین کو مقررہ مدت کے اندر اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے گا۔ یہ مقررہ مدت کب کی ختم ہو چکی ہے مگر اسلامی نظریاتی کونسل کی سالانہ رپورٹیں کبھی اسمبلی کے ایجنڈے پر بھی نہ آ سکیں(۳۷)۔

دستور میں درج ہے کہ ہر دس سال بعد ملک بھر میں مردم شماری ہو گی، لہٰذا ۱۹۹۱ء میں دستوری طور پر مردم شماری کرانا ضروری تھا مگر اس دستوری بندش کے مزید کئی سال گزرنے کے بعد

بے دلی سے ایک ایسی مردم شماری کا انعقاد ہوا جس کے نتائج سال ہا سال کے بعد بھی سرکاری طور پر سامنے نہیں آ سکے۔

یہ مثالیں دینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اتنی مضبوط دستوری گرہوں کے باوجود دستور کے مؤثر حصوں کو بے جان کر دیا گیا ہے تو یہ بات کہیں زیادہ قابل عمل ہے کہ پہلے کسی غیرمسلم شخصیت کو دس بیس سال تک سیاسی اعتبار سے صحافت کے ذریعے تراش کر عوام کے ذہنوں پر نقش کیا جائے۔ جب وہ اسمبلی تک پہنچ جائے تو صدر اسے وزیراعظم نامزد کر دے اور مسلمان وزیراعظم کے لیے مقررہ حلف پڑھنے کے موقع پر بحث کا دروازہ کھلے تو اس غیرمسلم وزیراعظم کے حق میں کئی دلائل سے مزین دستوری سہولتیں خود دستور کے اندر موجود ہوں۔

مثلاً دستوری طور پر ریاست کا مذہب اسلام ہو گا اور تمام امور اسلامی تعلیمات کے مطابق چلائے جائیں گے۔ اس اصول کا اطلاق قتل کے مقدمات پر کیا جائے تو قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کو حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دستور یہ اختیار صدر کو بھی دیتا ہے۔ اس تضاد کی توجیہ یوں کی جاسکتی ہے کہ جہاں عموم اور خصوص میں تعارض ہو' وہاں خصوص کو فوقیت ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا دستوری عموم ہے اور صدر کا قاتل کو معاف کرنا خصوص ہے' اس لیے اسے فوقیت ہے۔

اسی طرح وزیراعظم کے حلف کی عبارت ایک دستوری تقاضے کا نتیجہ ہے جب کہ دستوری تقاضے میں مسلم غیرمسلم کی کوئی شرط نہیں تو حلف میں کیونکر ہو سکتی ہے۔ یہاں عموم اور خصوص کا اصول پیش نظر رکھا جائے تو خصوص عموم پر مقدم ہے۔ خصوص میں مذہب کی شرط نہیں اس لیے عموم (حلف نامہ) میں بھی نہیں ہو سکتی۔

مذکورہ بالا دعویٰ اس حقیقت کے اعتراف کے ساتھ کیا گیا ہے کہ ۹۷ فی صد مسلم آبادی کے اس ملک میں کسی غیرمسلم وزیراعظم کی تقرری کا امکان بہت کم ہے لیکن اس اعتراف کے اندر یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ امکان بہرحال موجود ہے' اگرچہ بہت کم ہے۔ اس لیے دستور کی اصلاح کرتے ہوئے اس آرٹیکل کو بھی مشرف بہ اسلام کرنا ناگزیر ہے۔

تبلیغ مذہب کی اجازت: دستوری صورت حال اور اسلامی تعلیمات

دستوری عبارت کا ترجمہ یوں ہے ''قانون' عوامی انضباط اور اخلاق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر شہری کو حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنے مذہب پر ایمان رکھے' اس پر عمل کرے اور اس کی تبلیغ کرے۔ (۳۸)''

پاکستان کے مسلمانوں کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی حدود کے اندر اسلام کے علاوہ دیگر تمام مذاہب کی تعلیمات باطل ہیں۔ جس علاقے میں کسی اور مذہب کے پیروکار آباد ہیں، انہیں حق حاصل ہے کہ اپنی حدود میں اپنے ہی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی اجازت دیں اور دیگر مذاہب کو باطل قرار دیں۔ یہ بات سب کے لیے، قطع نظر کسی خاص مذہب کے یکساں ہے اور یہ کہنا مشکل ہو گا کہ کوئی سلیم الفکر اس بات سے اختلاف کرتا ہے۔

پاکستان کے مسلمانوں نے یہ ملک اسلامی تعلیمات کے فروغ اور اشاعت کے لیے حاصل کیا تھا۔ اور دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی طرح ان کا بھی ایمان ہے کہ ان کے مذہب کے سوا دیگر تمام مذاہب کے عقائد کم از کم اس خطہء زمین کی حدود کے اندر بہرصورت باطل ہیں۔ یہ نکتہ ان کے دین اور ایمان کی خشت اول ہے جس کی کجی کا نتیجہ تأثر یا دیوار کی کجی کے مترادف ہے اور دیوار کی کجی عمارت کے ضعف پر منتج ہوتی ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ایمان کو عمارت قرار دیں یا پاکستان کو عمارت سے تشبیہ دیں، ہر دو صورتوں میں ضعف کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے، بالآخر اسلام اور اسلامی تعلیمات کا انہدام-!

دنیا کے کسی بھی حصہ پر نظر دوڑانے سے بہ آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اپنے وجود کا انہدام نہ فرد کو گوارا ہے، نہ معاشرہ اس کا متحمل ہو سکتا ہے، اور نہ ریاست اس اجتماعی خودکشی کی راہ پر چل سکتی ہے۔ امریکہ یا فرانس ہی کو دیکھ لیں جن کے نظریے کی بنیاد ''آزادی'' پر ہے۔ چنانچہ ان ملکوں کے کسی ادارے پر نظر دوڑائیں، آزادی کے منافی ہر رویے کو وہ لوگ آہنی قوت سے کچل ڈالنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ حریت کے منافی کسی بھی رویے یا نظریے کو وہ لوگ آزاد رکھنے کی بجائے قید کرنے اور حتیٰ کہ کچل دینے کی حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں تو غلط نہ ہو گا۔ ان کی اس آزادی کی کوئی حدود نہیں ہیں۔ ہر شخص اپنے بارے میں حیوانی حد تک بے لباس ہونے کا مجاز ہے۔ پچھلی چند صدیوں سے ان مغربی معاشروں کی ذہنی ساخت کچھ اس رخ پر تربیت حاصل کر چکی ہے کہ آزادی کے منافی وہ لوگ کسی رویے کو اپنے معاشرے میں جگہ دینے کو تیار نہیں۔

موجودہ اشتراکی چین میں اشتراکی نظریات کے منافی کسی نظریے کی تبلیغ ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ایسے مذاہب یا نظریات کو اپنی پختہ فکری پر کوئی شبہ ہوتا ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ تبلیغ کا تعلق دانشور اور اصحاب علم کی حد تک ہی نہیں ہوتا، اس کی وسعت معاشرے کے ان عام افراد تک ہوتی ہے جنہیں افکار و نظریات اور مذاہب کی گہرائی کا شعور نہیں ہوتا۔ یہ لوگ خالی

الذہن ہوتے ہیں اور انہیں کسی مذہب سے برگشتہ کر کے کسی نئے مذہب میں شامل کرنا مشکل نہیں ہوتا۔

فرانس، امریکہ اور اشتراکی چین کی طرح اسلام بھی اپنی حدودِ عمل میں اپنے منافی کسی دوسری فکر کی آبیاری کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی ریاست کی حدود میں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی تبلیغ کی مطلقاً اجازت نہیں دی جا سکتی۔ قاضی ابویوسف نے اس مسئلے پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ امام صاحب اپنی مملکت کے قاضی القضاۃ (Chief Justice) ہی نہیں تھے، ابن کثیر کے بقول وہ قاضی قضاۃ الدنیا تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید ریاستی امور میں اپنی راہنمائی کے لیے موصوف سے اکثر و بیشتر رجوع کرتے رہتے تھے۔ جسے آج کل کی زبان میں عدالتِ عظمیٰ کو ریفرنس سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ خلیفہ کے استفسار پر امام ابو یوسفؒ جواب دینے سے قبل اپنے ساتھی اہل علم کی مجلس (Full Court Reference) میں وہ سوال برائے بحث پیش کرتے۔ اس علمی مشق کے نتائج امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج کے نام سے کتابی شکل میں مرتب کیے۔اس لیے اس کتاب میں امام ابو یوسفؒ کے افکار کی حیثیت سہ گانہ ہے۔ اولاً تو یہ اپنے وقت کی سپر پادر --- اسلامی ریاست--- کے چیف جسٹس کی سرکاری آراء (Authorities) ہیں جو ریاست میں نافذالعمل تھیں۔ دوم یہ چیف جسٹس کی انفرادی آراء نہ تھیں بلکہ یہ کورٹ کے فل بنچ کے فیصلے تھے اور سوم یہ کہ انہی فقہی آراء کی بنیاد پر بعد میں بلاد و امصار کے حکمرانوں نے مزید قانون سازی کی جو آج فقہ اسلامی قرار دی جاتی ہے۔ ایک استفسار کے جواب میں امام علیہ رحمہ اہل ذمہ کے بارے میں یوں رولنگ دیتے ہیں :

> ان لوگوں کو شہر میں کسی نئے صومعہ [یہودی عبادت گاہ Synagogue] یا گرجا گھر کی تعمیر کی اجازت نہ دی جائے۔ صرف وہی کلیسا باقی رہنے دیئے جائیں جو معاہدہ صلح کرتے اور ذمی کی حیثیت اختیار کرتے وقت موجود تھے۔ ان کو مسمار نہیں کیا جائے گا(۳۹)۔

اصل میں اسلامی ریاست میں بسنے والے غیرمسلم باشندوں کی حیثیت دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ کوئی علاقہ جنگ کے ذریعے یا بغیر جنگ کے مسلمانوں کے قبضے میں آ جائے اور وہاں کے غیرمسلم باشندے اسلامی حکومت سے معاہدہ کر لیں تو معاہدے کی شرائط کے تحت ان سے آئندہ معاملات کیے جایا کریں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جنگ میں غیرمسلم باشندے آخر تک ہتھیار نہ ڈالیں لیکن

بالآخر مغلوب ہو جائیں۔ شریعت اسلامی کے احکام دونوں کے لیے مختلف ہیں۔

اسلامی تاریخ میں پہلی قسم کے غیرمسلم باشندوں کی مثال نصاریٰ بنو تغلب کی ہے۔ حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت میں یہ لوگ مملکت کے ایک ایسے سرحدی مقام پر رہتے تھے کہ اگر وہ لوگ دشمن سے تعاون کرتے تو مسلمانوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ حضرت عمرؓ کو مشورہ دیا گیا کہ مناسب ہو تو ان لوگوں سے رعایت کرتے ہوئے صلح کر لی جائے۔ یہ تجویز مان لی گئی اور ان شرائط پر صلح ہوئی کہ وہ اپنی اولاد میں سے کسی کو بپتسمہ نہیں دیں گے یعنی ان کی اولادیں عیسائی نہیں ہوں گی۔ ان سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا لیکن زکوٰۃ کی شرح سے دگنا محصول وصول کیا جائے گا۔ اس طرح انہیں ہر چالیس بکریوں پر دو بکریاں سالانہ محصول ادا کرنا پڑا۔ اس باب میں عورت مرد برابر ہوں گے لیکن بچے اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ان کی زمینیں ان کے قبضے میں رہیں گی لیکن زمین سے جو محاصل مسلمانوں سے وصول کیے جاتے ہیں' ان کے دگنے نصاریٰ بنو تغلب سے وصول کیے جائیں گے۔

بعد میں یہ لوگ اپنی اولادوں کو بپتسمہ دینے لگے۔ اس لیے خلیفہ ہارون الرشید کے استفسار پرامام ابو یوسفؒ کی رولنگ یہ تھی کہ اب ان لوگوں سے معاہدہ کالعدم ہو گیا(۴۰)۔ اس قسم کے لوگوں سے معاملہ کرنے کا مدار وہ معاہدہ ہوتا ہے جو فریقین کے مابین طے پاتا ہے۔ اسی سے ان کی عبادت گاہوں کے معاملات' مذہبی رسوم و شعائر اور دیگر امور طے پاتے ہیں۔ یہ غیرمسلم باشندے اب اسلامی ریاستوں میں باقی نہیں رہے۔

دوسری قسم کے غیرمسلم وہ ہیں جو اسلامی لشکر سے جنگ کرتے ہوئے مغلوب ہو جائیں۔ ایسے لوگوں کے لیے فوجی خدمت یا جزیے کی شرط ہوتی ہے۔ ان کو نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت نہیں اور ان کی پہلی عبادت گاہیں مسمار کی جاتی ہیں۔

اس دوسری قسم کے غیرمسلم باشندوں کو اپنے شخصی قانون (Personal Law) کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ شرب خمر' اکل لحم خنزیر' صلیب نکالنے' ناقوس بجانے کے معاملے میں اجازت کا مسئلہ صورت حال پر موقوف ہے۔ ان میں سے علی الاعلان کیے جانے والے کام مسلمانوں کی بستیوں میں ممنوع ہیں۔ بری افعال جیسے شرب خمر' اور اکل لحم خنزیر کی حد تک تو اجازت ہوتی ہے لیکن شراب کی تیاری' تیاری سے متعلق جملہ براہ راست ظاہری امور' شراب کی فروخت' خنزیر کو کھلے عام چھوڑنا' اس کے گوشت وغیرہ کی خرید و فروخت' فواحش کا علی الاعلان ارتکاب'

یہ سب کام مسلمانوں کی بستیوں میں مطلقاً ممنوع ہیں [۴۱]۔

جہاں تک ان کے شعائر دین کی علی الاعلان بجا آوری کا تعلق ہے تو غیر مسلم اپنی بستیوں میں یہ کام کر سکتے ہیں۔ لیکن ناقوس صرف کنیسوں کے اندر ہی بجایا جانا چاہیے۔ کاسانی کہتے ہیں :

و کذا لوضربوا الناقوس فی جوف کنائسھم القدیمة لم یتعرض لذلك لان اظهار الشعائر لم یتحقق۔ [۴۲]

ترجمہ: اور اسی طرح اگر وہ (ذمی) اپنے قدیم (پہلے سے تعمیر شدہ نہ کہ نئے) کنیسوں کے اندر ناقوس بجائیں تو انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ شعائر کا اعلانیہ اظہار نہیں ہے۔

اسلام کے سوا کسی مذہب پر عمل کرنا اور اس عمل کا اظہار' یا اظہار کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اس مذہب کی تعلیمات کی اشاعت دو الگ الگ کیفیات ہیں۔ مذہب پر عمل کے لیے تو اسلامی تعلیمات واضح ہیں۔ کسی پر کوئی جبر نہیں کہ وہ اپنے مذہب پر عمل کرے لیکن اسلام اس کی اعلانیہ اشاعت کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ اگر کسی مسلمان کی بیوی نصرانیہ ہو تو شوہر کو حق نہیں ہے کہ وہ اسے عبادت سے روکے۔ اس کی بیوی کا حق ہے کہ گھر کے جس حصے میں چاہے' دوسروں کے معمولات میں خلل اندازی کے بغیر عبادت کر سکتی ہے لیکن اسے گھر کے اندر صلیب نصب کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کاسانی کہتے ہیں :

لایمکنھا من نصب الصلیب فی بیته۔ [۴۳]

ترجمہ: اس (بیوی) کے لیے ممکن نہیں کہ اس (شوہر) کے گھر میں صلیب نصب کرے۔

پاکستان کے غیر مسلموں کا حقِ تبلیغِ مذہب

غیر مسلموں کی یہ دوسری قسم اسلامی ریاست میں اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتی۔ یہ قسم ملک میں موجود نہیں ہے۔ تاہم اب تک کی گفتگو سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اسلامی ریاست کی حدود عمل میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کی اشاعت اساسی اعتبار سے اولاً ممنوع ہے اور اگر کبھی اس کی جزوی اجازت دی گئی تو یہ کام کراہیت کے تحت اور زمینی حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے کیا گیا۔ اسلامی تعلیمات کے منافی کسی کام کی اشاعت کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم نہ تو وہ مغلوب باشندے ہیں جن سے کوئی معاہدہ صلح ہوا ہے' لہٰذا کسی معاہدے کی توجیہ کا سوال خارج از امکان ہے۔ یہ لوگ ذمی بھی نہیں ہیں کہ یہاں جزیہ

دے کر رہیں۔

برصغیر پاک و ہند کی فتوحات کے وقت مختلف علاقوں میں غیرمسلموں سے جو معاملات طے ہوئے تھے، مسلمانوں کا دور حکومت ختم ہوتے ہی وہ کالعدم ہو چکے ہیں۔ بعد کا انگریزی دور حکومت کسی قاعدے قانون یا معاہدے کا انعکاس نہیں تھا اور نہ پاکستان اس دور حکومت کا تسلسل ہے۔ پاکستان کی نیو کب اور کن خطوط پر پڑی، یہاں اس بابت تفصیلی گفتگو کا محل نہیں ہے۔ اختصار سے یہ کہہ دینا بے محل نہ ہو گا کہ تقسیم ہند سے ذرا قبل ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے وقت سے یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ ہندوستان نے مذہب کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم ہونا ہے۔ یہ نوشتہ دیوار تھا جسے تمام فہمیدہ لوگوں نے سمجھ کر پڑھ لیا تھا۔ اس تقسیم کی بنیادیں بھی واضح تھیں۔ ہندوستان اس وقت ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، بدھ، جین، احمدی اور کئی دوسرے چھوٹے مذاہب کے پیروکاروں میں منقسم تھا۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے علاوہ دوسری قوموں کے افراد نے بھی کسی حد تک حصہ لیا ہو، لیکن یہ کہنا ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر کسی بھی دوسرے مذہب نے خطہ ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں مذہب کی بنیاد پر اپنے لیے الگ ریاست کے لیے جدوجہد یا مطالبہ کیا ہو۔ متحدہ ہندوستان میں ان تمام دوسرے مذاہب کے اکثر پیروکار آزادی کی جدوجہد میں ہر زاویے سے خاموش تماشائی اور انگریزی سلطنت کے وفادار شہری کی حیثیت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اس جدوجہد میں ان مذاہب کی لغت میں نہ تو کالا پانی کی اصطلاح ہے، نہ ان لوگوں کی عبا اسیران مالٹا جیسے موتیوں سے تیار مالا سے مزین ہے۔ نہ یہ لوگ کسی ریشمی رومال نامی تحریک سے واقف ہیں۔ نہ کبھی ان لوگوں نے گھر چھوڑ کر کسی دوسرے ملک کو ہجرت کی۔ ان میں سے کسی کی تاریخ بھی سید احمد شہید کی تحریک جہاد جیسی کسی تحریک کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس طرح مسلمان تقسیم ہند کی کوششوں میں کامیاب ہوئے۔ ان کو الگ خطہ زمین مل گیا جس کا مقصد وجود ہی اسلام تھا۔

تقسیم کے بعد ہندو اور سکھ غالب تعداد میں یہاں سے ہجرت کر کے ہندوستان چلے گئے۔ جو ہندو، سکھ اور دیگر مذاہب کے پیروکار یہاں باقی رہ گئے، غیراعلانیہ طور پر(Impliedly) انہوں نے یہاں رہنا اسی لیے پسند کیا تھا کہ یہ ملک مسلمانوں نے اپنی تاریخی جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے۔ اب وہ اپنی خواہشات کے مطابق اسے ترتیب دیں گے۔ جس چیز کی اجازت ان کا مذہب انہیں دیتا ہے، وہی کام کریں گے اور جس کام سے مذہب انہیں روکتا ہے، وہ اُس سے باز رہیں گے۔ یہ مسلمانوں کا ناقابل تنسیخ حق ہے اور وہ اس ملک میں اکثریت میں ہیں۔

یہ حقیقت قبول کر لینے کے بعد تمام غیرمسلم اس ملک کے شہری بن گئے ہیں جن کو دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی تمام شہری آزادیاں اور بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں جن کی تفصیلی وضاحت قائدِاعظم نے دستور ساز اسمبلی کے سامنے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو کی تھی۔ رہا ان کا اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق تو مذکورہ بالا اسلامی تعلیمات ،جنگ آزادی اور مطالبہ تقسیم ہند کے بعد اس طرح کی باتیں بے مقصد اور بے اصل ہیں۔ ان کا مقصد پراگندگی اور انتشار کے سوا کچھ نہیں۔ منطق ' دلیل' تاریخ حقائق اصول معاہدہ ان سب میں سے کوئی شے اس کی تائید نہیں کرتی۔

اس لیے دستورِ پاکستان کا آرٹیکل ۲۰ اور اس کی شق اے قرآن و سنت سے ہم آہنگ قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ امید ہے اہل علم ان امور پر مزید غور کریں گے۔

خلاصہ

راقم نے اپنے فہم کے مطابق اس مقالے میں ان دستوری مقامات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جو صراحتاً بیان کیے جا سکتے ہیں۔ دستور کے تفصیلی مطالعے سے بعض دیگر ایسے مقامات بھی زیرِ بحث آ سکتے ہیں جو مجموعی اسلامی فکر سے متصادم ہوں۔ یہ کام عدالتی عمل سے مشروط ہے یا اس کے لیے الگ سے طویل تحقیق کی ضرورت ہے۔ اہل علم سے توقع ہے کہ وہ اس مقالے میں مندرج نکات پر مزید غور کر کے بحث کو آگے بڑھائیں گے۔

حواشی

ا۔ دستوری رائے دہی کے عمل میں دستور ساز اسمبلی کے علاوہ کئی اور اداروں نے بھی حصہ لیا۔ ۱۹۸۳ء میں حکومت نے دستوری سفارشات کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جو اپنے سربراہ مولانا ظفر احمد انصاری کے نام پر انصاری کمیشن کہلایا۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ ۱۹۸۳ء میں پیش کی۔ اسی عرصے میں اسلامی نظریاتی کونسل سے بھی نئے سیاسی نظام کی داغ بیل کے لیے الگ سے دستوری سفارشات بعنوان ''اسلامی نظام حکومت کے بارے میں دستوری سفارشات'' تیار کر کے حکومت کو دیں۔ ۱۹۹۱ء میں کونسل نے Report on the Constitutional Reforms کے عنوان سے ایک اور دستاویز تیار کر کے حکومت کو پیش کی۔ یہ تینوں دستوری دستاویزات یا تو اسلامی اصولوں کے مطابق ایک نئے ریاستی نظام سے متعلق ہیں یا یہ موجودہ دستوری دفعات کو اسلام کی نسبت سے زیادہ فعال اور مقوی دیکھنے کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ رب کریم نے توفیق دی تو راقم ان تینوں دستاویزات کا جائزہ لے کر علیحدہ سے ایک مقالہ تیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

2. *The Constitution of the Islamic Republic of Pakistan*, Government of

Pakistan, Ministry of Law, Justice and Human Rights, 2004, Article 227.

3. *Ibid,* articles 228-231.

۴۔ قراردادمقاصد ۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان نے پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں پیش کی۔ اس قرارداد پر چھ دن بحث ہوئی۔ ۱۲ مارچ کو اسے تمام مسلم ارکان دستوریہ کے اتفاق رائے اور تمام غیرمسلم ارکان دستوریہ کی مخالفت کے بعد اختیار کر لیا گیا۔ ملاحظہ ہو:

Constituent Assembly of Pakistan Debates, vol.V, No.1-5 published by the Manager of Publications, Government of Pakistan, Karachi 1949, p.1-101.

۵۔ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو پہلی دستوریہ سے قرار داد مقاصد کی منظوری کے ساتھ ہی بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) قائم ہوئی جس کے ذمہ دستور کے راہنما اصول مرتب کرنا تھا۔ Dr Safdar Mahmood, *The Constitutional Foundations of Pakistan,* Publishers United Ltd, Lahore, 1975, p.24

6. Dr Safdar Mahmood, op.cit. p. 127.

7. A.K. Brohi: *Fundamental Law of Pakistan,* Din Muhammad Press, Karachi, 1958, p. 803.

8 Dr Safdar Mahmood, *ibid*, p. 503.

9. *Ibid,* p. 807.

10. *The Constitution of Islamic Republic of Pakistan,* article 2-A.

11. *PLD* 1992 SC 595 p. 621.

12. *The Constitution of Islamic Republic of Pakistan*, article 45.

13. *Ibid,* article 9.

14. *Ibid,* article 10.

15. *Ibid*, article 10(5).

16. *Ibid*, article 10(6).

۱۷۔ ابن قیم الجوزیہ' الطرق الحکمیة فی السیاسة الشرعیة' قاھرہ ۔ مطبعة السنة المحمدیہ' ۱۹۵۳ء' ص ۱۶

۱۸۔ سدالذرائع سے مراد یہ ہے کہ ان ذرائع کے راستے میں دیوار کھڑی کر دی جائے جو فاعل کے فعل کو بالآخر کسی مَفسدہ کی طرف لے جاتے ہیں' اگرچہ فعل بذات خود باعث فساد نہیں ہوتا۔ نامحرم عورت سے تنہائی میں ملنا بظاہر معصوم فعل ہے' لیکن انسانی فطرت کے خالق' اللہ کریم نے مکلفین کو ایسے اختلاط سے روک دیا کہ یہ راستہ بالآخر حرام کاری کی طرف لے جا سکتا ہے۔

۱۹۔ نیز ملاحظہ ہو ، ڈاکٹر وھبہ الزحیلی : اصول الفقه الاسلامی، الجز الثانی، دار الفکر، دمشق، ۱۹۸۶ء ص ۸۷۳

۲۰۔ قرآن ، ۳ : ۷۹

۲۱۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بحستانی: السنن، کتاب القضاء، باب فی الدین ھل یحبس به، دارالدعوۃ ،استنبول ۱۴۰۱ھ

۲۲۔ ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ : الجامع الصحیح، ابواب الحدود باب ماجاء فی درء الحدود، استنبول، دارالدعوۃ، ۱۴۰۱ھ

۲۳۔ ابویوسف، امام یعقوب بن ابراہیم ' کتاب الخراج ' (اسلام کا نظام محاصل) مترجم محمد نجات اللہ صدیقی' مکتبہ چراغ راہ' کراچی ۱۹۶۶ء' ص ۴۹۱

۲۴۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء ،آرٹیکل ۱۰

۲۵۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء، ایضاً، آرٹیکل (۴) ۱۰

۲۶۔ سرخسی' محمد بن احمد : المبسوط' مصر' مطبعہ السعادۃ' ۱۳۲۴ھ' ج ۱۰' ص ۱۲۵

۲۷۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء ،آرٹیکل (۱) ۴۹

۲۸۔ قرآن، ۲۲ : ۴۱

29. Dr Safdar Mahmood, *ibid*, p. 133, article 21.

۳۰۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء ،آرٹیکل ۴۵

۳۱۔ تفصیلی احکام امام ابویوسف کی کتاب، کتاب الخراج میں ملتے ہیں۔

32. *PLD* 1992 Lahore 99 p.123.

33. Dr Safdar Mahmood, *op.cit.* p. 833 article 91(2).

۳۴۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء ،۲۰۰۴ء آرٹیکل (۲)ا ۹

۳۵۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء ملاحظہ ہوتیسرا جدول

۳۶۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء ،آرٹیکل ۲۵۱

۳۷۔ ایضاً آرٹیکل ۲۲۸ تا ۲۳۱

۳۸۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء، آرٹیکل ۲۰ اور ۲۰ الف

۳۹۔ ابویوسف' امام' ص ۲۔۳۹۱

۴۰۔ ایضاً ص ۹۱

۴۱۔ کاسانی' علاء الدین ابی بکر بن مسعود' بدائع الصنائع 'ایچ ایم سعید کمپنی' کراتشی' (۱۴۰۰ھ) ج ۷ ص ۱۱۳

۴۲۔ کاسانی' ایضاً' ج ۷' ص ۱۱۳

۴۳۔ کاسانی' ایضاً' ص ۱۱۴